ہوئے اس کے دونوں کندھے زور سے الگ کرتے ہوئے چمکار کر بولا "لے اب سیدھی ہو کر بیٹھ جا اور مجھے روٹی کھانے دے۔"

شاداں نے سر اوپر اٹھا کر کہا "تو اس طرح سے روٹی نہیں کھا سکتا بھلا!"

تو سلیمان نے سر ہلا کر ہنس کر کہا "نہیں۔"

شاداں تیزی سے اس کے بازوؤں میں گھومی اور منہ سامنے کر کے بیٹھ گئی۔ سلیمان نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر رکھ دی اور نماز کی نیت جیسے دونوں بازو اس کے پیٹ پر باندھ کر بولا "اچھا بھئی تیری مرضی، نہ کھانے دے روٹی۔"

رضوان نے آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھے جب دوربین میں سے یہ سین دیکھا تو اس کی جھولی میں ٹپ سے ایک آئیڈیا گرا۔ جب شیشے کی سلاخ کو ریشم کے پارچے پر رگڑا جاتا ہے تو اس میں الیکٹرونوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور یہ مثبت بن جاتی ہے، ادھر ریشمی پارچے میں الیکٹرون بڑھ جاتے ہیں تو وہاں منفی فیلڈ کے تیار ہونے سے شیشے کی سلاخ چارج ہو جاتی ہے — عین اسی طرح اس کا دماغ چارج ہو گیا۔

یہ اس کے تھرڈ ائیر کے زمانے کی بات ہے۔ موسم نہایت خشک تھا۔ دن بھر سخت لو چلتی رہی تھی اور آسمان پر کئی روز سے غبار کا دبیز سائبان تنا ہوا تھا۔ اپنے ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں رضوان ابھی تک چینی قالین پر اضطراب کے عالم میں چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی وہ پلنگ پر بیٹھ کر غصے سے غالیچے پر پاؤں مسلنے لگتا، کبھی اٹھ کر پھر چھوٹے چھوٹے چکر کاٹنے شروع کر دیتا۔

پورے تین سال تک سچی محبت کا دم بھرنے کے بعد شہلا اپنے ماموں زاد سے منسوب ہو کر جدہ جا رہی تھی جہاں اس کے والدین اس کی شادی کر رہے تھے۔ اس نے رو رو کر رضوان کے نام خط لکھا تھا اور بھاگ بھاگ کر تین دن میں جدہ جانے کی تیاری مکمل کر لی تھی!

جب رضوان نے پنجرے کے شیر کی طرح دبیز ریشمی غالیچے پر چکر لگا لگا کر شہلا کی بے وفائی کا بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اس نے اپنی رسٹ واچ اتار کر میز پر رکھی۔ جیب سے شیفرز کا قیمتی قلم نکال کر تکیے کے نیچے رکھا اور اپنے کان شنٹ کرتے اس انجن پر لگا دیے جو رات کے سناٹے میں چھجو بھگت کے چوبارے کے پیچھے

وافر سٹیم چھوڑ رہا تھا۔

اس نے خودکشی کے ارادے سے شہلا کا خط اپنی جیب میں رکھا اور رات کی تاریکی میں دروازہ کھولنے کو آگے بڑھا۔ جونہی اس کا ہاتھ پیتل کی ناب سے مس ہوا، ایک زور کا پٹاخہ چلا اور ایک شفاف شعلہ ثانئے بھر کو کمرہ روشن کر گیا۔ رضوان خوف سے کانپنے لگا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ صاف اشارہ ہو گیا تھا کہ ابھی خودکشی کی ضرورت نہیں، معاملات خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔

معاملات تو ٹھیک نہ ہو سکے البتہ رضوان کو اس حقیقت کا اچھی طرح سے علم ہو گیا کہ اس رات پیتل کی ناب کو ہاتھ لگاتے ہی اس کی انگلیوں نے شکارا کیوں مارا تھا اور جھٹکا کس لیے کھایا تھا!

اپنی آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھے جب رضوان ایس ڈی او نے سلیمان کی گود میں شاداں کو اس طرح بل کھاتے اور پھرکی بنے دیکھا تو لامعلوم کی دنیا سے اس کی جھولی میں ایک آئیڈیا اترا کہ اگر کسی انسان کے کھلے بازوؤں کے اندر کوئی دوسرا انسان ہلکی، بھاری یا تیز گردش کرنے لگے تو وہاں ایک الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ پیدا ہو جاتی ہے، عین اسی طرح سے جیسے آرمیچر کے اندر روٹر کے گھومنے سے برقی رو پیدا ہو جاتی ہے — انسانی برقی رو سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جیسے ہائیڈرو الیکٹرک کرنٹ سے اٹھایا جا سکتا ہے۔

ایس ڈی او رضوان نے اپنا تجرباتی بکسا اٹھایا، جیپ نکالی اور سیدھا لوکیشن پر پہنچ گیا۔ سلیمان چوکڑی مارے کھانا کھا رہا تھا، شاداں سامنے بیٹھی سلیمان کے پھٹے ہوئے صافے کو موٹے موٹے تروپے مار رہی تھی، گائے اور اس کی چھوٹی بچھیا کٹے ہوئے کھیت میں اکا دکا ڈنٹھلوں کی چرائی کر رہے تھے، رہٹ کے بیل چل رہے تھے اور جھلار سے ٹھنڈا پانی آڈ میں گر رہا تھا۔ رضوان نے اپنی جیپ ایک جھٹکے سے ان کے قریب روکی اور چھلانگ مار کر باہر نکلا تو سلیمان نے برتنوں کی طرف اشارہ کرکے کہا آؤ جی ایس ڈی او صاحب! بسم اللہ کرو۔"

رضوان نے محبت بھرے ہاتھ سے نفی کا سگنل ہلاتے ہوئے کہا "بہت بہت مہربانی، ڈھیر سارا شکریہ۔ کھانا میں نے کھایا تو نہیں، پر ابھی نہیں کھاؤں گا۔ آپ کے

ساتھ کھا لیا تو وہ روئے گا۔"

"کون بھاجی؟" شاداں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ جو میرا چوکیدار ہے، نور احمد۔ اگر وہ کھانا پکا کر رکھ دے اور میں کسی وجہ سے نہ کھا سکوں تو وہ دل ہی دل میں مجھے تین بار قتل کر کے چوتھی مرتبہ آپ خودکشی کر لیتا ہے۔"

شاداں رضوان کی اس بات پر کھل کر ہنسی اور سلیمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگی "یہ بھی میرے ساتھ کئی بار اسی طرح سے کرتا ہے۔ میں اسے قتل تو نہیں کر سکتی البتہ خودکشی ہر بار کر لیتی ہوں۔"

رضوان نے شاداں کی بات اَن سنی کر کے کہا "تم دونوں مجھ سے چھ سات برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ چھوٹے ہو۔ میں تم کو اپنے بچوں جیسے بہن بھائی خیال کرتا ہوں۔ اگر میں تم سے ایک فرمائش کروں تو پوری کرو گے؟"

فرمائش کا سن کر اور درخواست کا لہجہ جانچ کر دونوں کے چہرے پیلے پھٹک ہو گئے۔ خوف کے مارے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور وہ احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

رضوان نے کہا "میری بھی ایک چھوٹی بہن ہے، بالکل شاداں کی عمر کی۔ اس نے ابھی ڈاکٹری پاس کی ہے اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے گھر بھر کی لاڈلی ہے۔"

شاداں کا خوف ذرا سا دور ہوا تو اس نے ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا "میں بھی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں بھاجی اور میرے گھر والے بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

رضوان نے بھی تمہید چھوڑ کر اور دل کڑا کر کے کہا "لے پھر اگر تو میری بہن ہے اور اپنے آپ کو میری سگی بہن سمجھتی ہے تو ایک منٹ کے لیے سلیمان کی گود میں اسی طرح بیٹھ جا جیسے تو تھوڑی دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔"

ان دونوں کے چہرے ندامت، خوف، غصے اور خوشی سے سرخ ہو گئے!

تھوڑی دیر ان کو گم سم دیکھ کر رضوان نے کہا "میری اپنی بہن کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی اس لیے میں سلیمان ہی کو اپنا بہنوئی سمجھتا ہوں، اپنا چھوٹا بہنوئی ——"

سلیمان نے بات کاٹ کر کہا "کوئی عقل کی بات کرو ایس ڈی او صاحب! یہ کوئی منڈوہ نہیں یا قلم نہیں بن رہی کہ ہم کدکڑے مار کر اک دوجے میں لوٹیاں کھانے لگیں۔ ہے ناں عقل نہ موت۔"

رضوان نے مایوس ہو کر کہا "میں اپنا ایک علم دیکھنا چاہتا تھا — ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا — ایک میرا خیال تھا — لیکن خیر کوئی بات نہیں — میں آپ پر زور تو نہیں دے سکتا — نہ ہی کسی مان سے کہہ سکتا ہوں — ٹھیک ہے اگر کہیں میں دور پار کا سالا بھی ہوتا — یا شاداں میری رشتے کی بہن ہی ہوتی — اور نہیں تو میرے گاؤں کی دھی ہی ہوتی تو میں اس پر آدھا پچادھا حکم ضرور چلا لیتا، لیکن اب تو کوئی تعلق ہی نہیں —" وہ مایوسی کے عالم میں اپنی جیپ کی طرف چلا تو اس کا خیال تھا کہ شاداں اسے آواز دے کر روک لے گی، لیکن شاداں نے ایسا نہ کیا۔

جب وہ واپس ڈاک بنگلے پہنچا تو چوکیدار اس کا کھانا میز پر لگا کر اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ اس نے ڈونگے سے ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ کھانا وہی تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نسر کے چوکیداروں کو پکانا سکھا گئی تھی.... بھنڈی گوشت، ٹینڈے گوشت، مرغی کا پیلا سالن، کچی ہلدی، کچا مسالا، کچا لہسن، ساتھ توے کی بے سینکی روٹی جسے پھولنے سے روکا گیا تھا اور اس کی دو تہیں لگا کر، بھانڈ بچوں کی چھوٹی چپڑاس بنا کر، دسترخوان میں لپیٹا گیا تھا۔ چینی کی رکابی میں گلابی رنگ کی وہی نیم ٹھنڈی کسٹرڈ تھی جو لارڈ میکالے کو بہت پسند تھی اور جس کا مزا چوکیداروں کی چوتھی پشت گزر جانے پر دھوبیوں کی پیچ جیسا ہو گیا تھا۔

رضوان نے آدھی روٹی کھائی اور برتنوں کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر اور ان پر دسترخوان ڈال کر لمبی آبنوسی کرسی میں دراز ہو گیا۔ اس پر کوئی علم اتر رہا تھا لیکن اس کے ذہن کی لینڈنگ سٹرپ وہم اور گمان کے کھڈوں اور کھائیوں سے پٹی پڑی تھی اور کسی قسم کا آئیڈیا اس پر بغیر کریش کیے نہیں اتر سکتا تھا۔ رضوان نے کہا "ٹھیک ہے، کریش ہی سہی!"

جب گلاب پٹواری بڑے گیٹ میں داخل ہو کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا تو رضوان نے کھڑکی سے اپنا چہرہ نکال کر زور سے تالی بجائی اور اونچی آواز میں کہا

"گلاب! اس وقت نہیں، پھر کبھی آنا۔ ابھی میں نے تمہارا پچھلا اندارج بھی نہیں دیکھا۔ سب کچھ اکٹھا دیکھوں گا۔ اس وقت فرصت نہیں۔ مہربانی، شکریہ۔"

گلاب پٹواری چلا گیا تو وہ پھر سوچنے لگا کہ اگر بے جان چیزیں میگنیٹک فیلڈ کے اندر گھوم کر بجلی پیدا کر سکتی ہیں تو جان دار وجودوں نے کیا قصور کیا ہے؟ اگر ان کے اندر سچ مچ کی محبت کا مقناطیسی ہالا پیدا ہو جائے تو پھر وہ کیوں چارج نہیں کر سکتیں؟

وہ ایک آخری کوشش کرنے کو سلیمان کے گھر روانہ ہوا تو راستے میں تین مرتبہ اس کا حوصلہ ٹوٹا۔ دو مرتبہ تو چاگی کمہار کے باڑے اور کچی مسجد سے واپس لوٹا لیکن تیسری مرتبہ ٹوٹے حوصلے کو پھر کندھے پر ڈال کر سلیمان کے گھر پہنچ ہی گیا۔

ادھ کھلے دروازے کے اندر اس نے دیکھا کہ شاداں گدھی کے آگے پھک ڈالنے جا رہی ہے اور اس کی بوڑھی ساس مرغیوں کے لیے آٹے کے بڑے سے پیڑے سے چھوٹی چھوٹی مروڑیاں نوچتی ڈربے کی طرف منہ کئے کھڑی ہے۔ شاداں پھک کا تسلا وہیں زمین پر رکھ کر اپنی ساس کی طرف جھپٹی اور اس کو دونوں بازوؤں میں لے کے زور زور سے گھمیٹنیاں دینے لگی۔

اول اول تو "نی شاداں.... نی شاداں.... نی دفع ہو نئیں.... سورنئیں — میری جان نچوڑ دی مرنئیں — مجھے معافی دے دے —" کی آوازیں آتی رہیں لیکن پھر اس کے بعد اچانک معدوم ہو گئیں تو شاداں کے سسر نے مسجد جاتے ہوئے اپنی سوٹی وہیں ویہڑے میں پھینک کر بھاگ کے رحمتے کی جان بچائی۔

جب حاجی برکت اللہ اپنی بیوی رحمتے کو سہارا دے کر منجی کی طرف لے جا رہا تھا تو شاداں ٹپوسیاں مار مار کر پوچھ رہی تھی "ماسی حلوہ لاؤں حلوہ، باداموں اور کشمشوں والا حلوہ، جس میں اصلی کیسر بھی پڑا ہے۔"

حاجی صاحب نے ہنس کر کہا "اوئے شاداں اگر دو دفعہ اور تو نے اپنی ماسی کے ساتھ ایسا کس کے پیار کیا تو اگلی دفعہ اس کے قل ہو جانے ہیں۔"

شاداں نے کہا "ہائے میں مر جاؤں تایا جی، ماسی میں تو میری جان ہے۔ آج کے بعد ماسی کی چھٹی، آپ کی طلبی — اب میں آپ کو چک پھیریاں دیا کروں گی۔"

تایا جی حاجی برکت اللہ نے پھر ہنس کر کہا "جیسے تیری مرضی پتڑا۔ تیری خوشی

میں ہی ہماری خوشی ہے۔ تو چاہے ہماری جان نکال دے، سب حاضر ہے۔"

بڈا مرغا اڑ کر گدھی کی پیٹھ پر آ بیٹھا تو اس نے اتنے زور سے دولتی جھاڑی کہ پاس پڑی ہوئی جستی باٹی میں دو گہرے چپ پڑ گئے۔ مرغا پیٹھ سے گرا نہیں، دونوں پروں کی تالی بجا کر اذان دینے لگا۔ ساس نے دور بیٹھے بیٹھے نحیف آواز میں کہا "اس کو اتار۔ پرے دفع کر۔ گدھی کی پیٹھ الی کر دے گا۔"

شلواں نے تالی بجا کر اسے اڑانے کی کوشش کی تو وہ دھب سے زمین پر گرا اور پہلو کے بل لیٹی ہوئی باٹی کے اندر سے چنے کی دال کے موٹے موٹے دانے ٹھونگنے لگا۔

رضوان کو سو فیصد یقین ہوگیا کہ اس گھر کے اندر آپس کی محبت کا ایک مضبوط گرڈ سٹیشن قائم ہے اور یہاں سے ٹرانس مشن لائن کھینچی جا سکتی ہے۔ وہ کسی سے بات کیے اور کسی کو کہے بتائے بنا وہاں سے بھاگ کر واپس ڈاک بنگلے پہنچا اور اپنی ساگوانی صندوقچی اٹھا کر پھر سلیمان کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

ان لوگوں کا گھر کچا تھا۔ صحن میں ایک بیری تھی۔ بیری کے نیچے گدھی بندھی تھی۔ بیس بائیس مرغیاں تھیں۔ ایک بھینس تھی۔ بلی کے دو یتیم بچے اور کٹی ہوئی دم والا ایک ڈبو تھا۔ بیری کی اوپری کھوہ میں گلہری کی رہائش تھی۔ پچھلا گلہرا یکے کے نیچے آ کر مر گیا تھا اور اب وہ ایک نیا گلہرا لے آئی تھی جو عمر میں اس سے بہت چھوٹا تھا۔ صحن کے آخر میں ایک اندھی مائی رہتی تھی جس کو سارا کوٹ ددو اماں نینا کہہ کر بلاتا تھا۔ اماں نینا کی بولی سمجھنی کافی مشکل تھی اس لیے پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اصل میں کہاں کی رہنے والی تھی۔ بیس بائیس برس پہلے اس کو حاجی برکت اللہ نہر کے پل پر سے کاٹیڈ کر کے اپنے گھر لے آئے تھے اور بی بی رحمتے نے اس کی سیوا داری شروع کر دی تھی۔ اتنا پتا چلتا تھا کہ نہر کے پل پر اماں نینا کو اس کا بھتیجا اور بھتیجے کی بیوی یہ کہہ کر چھوڑ گئے تھے کہ ہم تیرے لیے کسی اچھے سے ہسپتال کی تلاش میں جاتے ہیں، ہمارا انتظار کرنا۔ تین دن تک تو وہ اسی انتظار میں بیٹھی رہی، پھر اس نے کراہنا شروع کر دیا اور برکت اللہ اس کا کراہنا سن کر ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے آیا۔

سلیمان کے گھر کا باہر کا دروازہ تھا تو پرانا، لیکن تھا کیل کی لکڑی کا۔ اس میں

لگے ہوئے کیل اور کوکے ابھی تک اپنی اپنی جگہ پر قائم تھے۔ پینٹ پالش نہ ہونے کی وجہ سے دروازے کی لکڑی بوسیدہ ضرور ہو گئی تھی لیکن کڑی دھوپ اور سامنے کی بارشوں کے باوصف تڑخی نہیں تھی، بائیں دروازے کی اوپر کے قلابے کا ایک آنکڑا البتہ اپنی جگہ چھوڑ کر ڈھیلا ہو گیا تھا۔ باقی سب ٹھیک تھا۔

رضوان نے ساگوانی صندوقچی کھول کر اس میں سے بکسی نکالی۔ تار کا ایک سرا اس نے دروازے کے اوپر کے آنکڑے سے لپیٹا اور بکس کی دوسری تار کو دوسرے دروازے کی آہنی چوتھی کے ساتھ باندھ دیا۔ زمین پر پڑی ہوئی بکسی کو اس نے لرزتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھا۔ اس میں پیتل کے دو ہولڈر اور مصالحے کے تین پلگ لگے تھے۔

دارے پانڈی کا ڈھیلو کتا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اماں رکھی کی بہو وہاں سے گزرتے ہوئے چور نگاہوں سے رضوان کو دیکھنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دارے کا پوتا بھی اپنے کتے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کتے سے دو تین انچ ہی اونچا تھا لیکن انسانی بچہ ہونے کے رشتے کتے سے بہت زیادہ چالاک نظر آتا تھا۔ اس نے رضوان کو اپنے محلے میں اس طرح بے باک کھڑے دیکھ کر عجیب سا محسوس کیا لیکن بچہ ہونے کی وجہ سے وہ اس عجیبت کا تجزیہ نہ کر سکا اور اپنے کتے پر کہنی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

رضوان نے گلی کے دونوں ناکوں پر سر گھما کر دیکھا اور پھر صندوقچی سے پچیس واٹ کا بلب نکال کر بکسی کے ایک ہولڈر میں لگا دیا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ چونکہ اس گاؤں کے لوگوں میں، ساری کی ساری بستی میں، سارے کے سارے لوگ ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا اور ایک دوسرے کی چاہت میں گرفتار ہیں اور سارے لوگ ایک ہی اعتقاد میں پورے کے پورے داخل ہو چکے ہیں اس لیے یہاں ایک پاور فل میگنیٹک فیلڈ کا وسیع تر دائرہ پیدا ہو گیا ہے جس میں برق کی تخلیق و تولید کا عمل جاری ہے۔

بلب لگانے کے بعد رضوان کے سر پر لاٹھی کی ایک زناٹے دار ضرب نے پہلے تو اس کا سر بھنایا، پھر اس کا اوپر کا دھڑ جھلایا اور بعد میں زانوؤں کے بل اسی طرح گرایا

جیسے جلاد گردن زدنی کو اپنی اور اس کی آسانی کے لیے بٹھایا کرتے ہیں۔

دارے کا پوتا اتنے بڑے بھائی کو گھٹنوں کے بل گرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے اس کا ڈھلیو کتا بھی حفاظت کناں کھسکا اور ساری گلی گھٹنوں کے بل گرے ایس ڈی او کے رحم و کرم پر رہ گئی۔

رضوان پر کالج کے زمانے میں مخالف سیاسی پارٹی کے لڑکوں کی طرف سے رائفل کے دستے کا شدید وار بھی سر پر ہی ہوا تھا لیکن وہ وار جسمانی ہونے کی وجہ سے اس قدر شدید نہ تھا جس قدر شدید امپیکٹ اس غیر مرئی وار کا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل، سلام پھیرنے کے انداز میں دونوں جانب دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ ہمت کر کے وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پر سرو قد کھڑا ہو گیا۔

پچیس واٹ کا بلب اپنی پوری تابانی کے ساتھ بکسی کے اندر روشن تھا اور اس کے گرد روشنی کا ایک چھوٹا سا ہالا بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے گھر کے پھاٹک پر دونوں ٹرمینل لائیو تھے اور دونوں سے کرنٹ بدستور آ رہی تھی۔ اس نے ساگوانی صندوقچی سے اپنا چھوٹا میٹر نکال کر اس کی سرخ اور سیاہ تاریں احتیاط سے پیتل کے پلگ میں ڈال کر دیکھیں تو میٹر کی سوئی ٹک سے 220 پر جا کر رک گئی —— نہ کم نہ زیادہ، نہ ہلچل نہ جھر جھر، نہ تنکے نہ جھٹکے، نہ فلکچوئیشن —— ٹھیک دو سو بیس! اس نے دونوں ٹرمینلوں سے تار کھولے، اپنا سامان اٹھایا اور ڈاک بنگلے روانہ ہو گیا۔

بالکل ایسی ہی ایک رات فیراڈے پر گزری تھی... جب اس نے گھوڑا کھولنے سے قبل اصطبل سے ایک پرانی نعل اٹھا کر دیکھی تھی جس کے اندر کسی نائٹ کی تلوار کا ایک زنگ آلود چھلا آپ ہی آپ حرکت سی کر رہا تھا۔ فیراڈے نے وہ نعل اٹھائی تو چھلا ٹرک کر کے نعل کے ساتھ چمٹ گیا۔ نعل مقناطیسی جا چکی تھی اور اس کے اندر کا چھلا اس مقناطیسی فیلڈ کے اندر ہل جل کر رہا تھا۔

بالکل ایسی ہی رات ایس ڈی او رضوان پر گزر رہی تھی جس کا تجربہ تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کا سائنسی سہار نہیں مل رہا تھا۔

اس کی تھیوری یہ تھی کہ ہر انسان کی اپنی ایک میگنیٹک فیلڈ ہوتی ہے جو اس کے وجود کے گرد کافی دور تک پھیلی رہتی ہے۔ اس فیلڈ میں اس کی سوچ، خوراک،

صحت، عبادت، جنس، محبت، خلت، معاملہ فہمی اور معاملہ بندی اپنے اپنے الیکٹرونوں کی بندش کے مطابق اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جب کسی زندہ گروہ میں یکساں مزاج، یکساں عمل اور یکساں کردار کا مظاہرہ ہو گا اور تسلسل کے ساتھ ہوگا تو اس کے اندر توانائی کے چھوٹے چھوٹے سوتے نمودار ہونے لگیں گے۔ جوں جوں جھومر ڈالتے یہ سوتے ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، ان کے مقناطیسی جذب سے توانائی کا بھنور ایک ٹربائین بن کر برقی رو کا مخزن بن جائے گا۔ اس پھیلتی ہوئی الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ کے کسی بھی مقام سے آمنے سامنے دو ٹرمینل فکس کر کے برقی رو کا چارج حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس بجلی اور دوسری بجلی کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ وہاں مخالف پول ایک دوسرے کے درمیان کشش کا باعث بنتے ہیں اور یہاں مطابق پول ایک دوسرے سے ہم آہنگی، ہم کاری اور ہم زوری کی وجہ بنتے ہیں۔ وہاں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک نیگیٹو پول ہو اور دوسرا پوزیٹو، لیکن یہاں یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ دونوں ہی پول پوزیٹو ہوں ایک بھرپور پوزیٹو پول، دوسرا اس کا ہمزاد، ایسے ہی شالی باجا۔ اس پول کی فیلڈ چاہے اتنی توانا نہ ہو لیکن اس کے الیکٹرون مقابلے میں پورے ہوں۔

رضوان نے پچیس واٹ کا بلب روشن کر چکنے کے بعد پورے تین دن کوٹ ودو کے لوگوں کا تنقیدی آنکھ سے جائزہ لیا اور ہر گروہ انسانی کو ایک پڑھے لکھے تجربہ کار انجینئر کی آنکھ سے جانچا اور ایک ماہر عمرانیات کے شماریاتی اصولوں پر پرکھا۔

کوٹ ودو کے لوگ، جانور، چرند پرند، حشرات، نباتات اس کی زہریلی گھاس پھونس اور نقصان دہ خس و خاشاک بھی پاکستان کے دوسرے علاقوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس علاقے کا ایک اپنا طلسم، ایک اپنی مقناطیسی فیلڈ اور ایک اپنا ہی کرشمہ تھا۔ جو کوئی بھی اس کے پانچ میل کے دائرے میں آ جاتا تھا اس کی کایا کلپ ہو جاتی تھی اور وہ نمبر دو سے نمبر ایک بلکہ خصوصی نمبر ہو جاتا تھا۔

یہاں کے لوگوں کو لڑنا نہیں آتا تھا۔ شرارتیں اور چھلیں کرنے کے فن سے البتہ خوب واقف تھے۔ نفرتیں پالنے کے علم سے ناآشنا تھے لیکن بات دو ٹوک کرتے تھے۔ راجپوتی شان اور براہمنی انا سے ناواقف تھے لیکن خوبی اور خودداری کی باریکیوں

سے خوب واقف تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی ہمت اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہر قسم کا اندوختہ جمع کرتا تھا اور اس کو "ہمارا اندوختہ" جان کر صرف کرتا تھا۔

سارے قصبے میں صرف تین عورتوں اور دو مردوں کی انا تھی لیکن وہ بھی بہت ہی کمزور۔ صبح گیارہ بجے تک مشکل سے بنتی لیکن شام کے پانچ بجے سے پہلے بجھ جاتی۔ ایک لڑکی جس کے ننھیال چندر بنسی راجپوت تھے اور ددھیال یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، بیاہ کر جب یہاں آئی تو پہلے چند مہینے تو پوری گھمنڈن رہی، پھر اس میں بھی یہاں کے لوگوں کی خاصیتیں ابھرنا شروع ہو گئیں۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ اور ہر دم مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کے میکے کو فکر دامن گیر ہو گئی کہ لڑکی سسرال میں میکے سے بھی زیادہ خوش ہے اور اس کی وجاہت، تمکنت، حرمت اور منصب میں کمی سی واقع ہونے لگی ہے اور وہ اشرافیہ سے ہٹ کر عامیہ میں مدغم ہوتی جا رہی ہے تو انہوں نے اپنی پرانی میراثن کو بچی کی غور و پرداخت کے لیے مستقل طور پر اس کے سسرال بھجوا دیا۔ لیکن کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ میراثن ہر صبح دلہن کو اس کے میکے کی معجون نفوق کے دو بڑے چمچے ناشتے کے بعد باقاعدگی سے کھلاتی تھی لیکن بارہ بجے کے بعد دلہن کی انا بالکل ختم ہو جاتی تھی۔ جیسے چھوٹے بچے ٹارچ جلا جلا کر اس کے سیل گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ہی ختم کر دیا کرتے ہیں، کچھ ایسی ہی حرکت دلہن کی تھی۔ دلہن اپنی پندار کی ٹارچ باہر جلانے کے بجائے اندر ہی اندر اس کی بیٹری شارٹ سرکٹ سے ختم کر دیتی تھی۔ مراثن کو دلہن پر بڑا غصہ آتا لیکن اس میں قصور دلہن کا نہیں تھا کوٹ ودو کی سرزمین کا تھا۔

یہی حال دوسری عورتوں اور دوسرے مردوں کا تھا۔ وہ ہر صبح ناشتے کے بعد وٹامن انا کی ایک گولی کھا کر ناشتہ ختم کرتے تھے لیکن یہ گولی ان کے وجود پر کوئی کاٹ نہیں کرتی تھی۔ جیسے گولی کھانے سے پہلے ہوتے، ویسے ہی اس کے بعد رہتے!

انجینئر رضوان نے کوٹ ودو کی ہوا، فضا، شفقہ مزاج اور طبیعت اور گاؤں والوں کی اجتماعی سرشت اور کوٹ ودو کے جغرافیائی بہاؤ سے فائدہ اٹھا کر وہاں ایک اتھیریکل پاور ہاؤس قائم کر دیا جو لوگوں کی آپسی محبت کے جزیٹ ہونے سے بجلی پیدا کرتا تھا۔ اس نے کوٹ کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے گرڈ سٹیشن قائم کر کے ان

کے نام گرڈ سٹیشن شرقی اور گرڈ سٹیشن غربی رکھ دیے۔ ان گرڈ سٹیشنوں سے قصبے کے لیے ٹرانس مشن تاریں چلتی تھیں اور دیواروں، ممٹیوں اور چھتوں پر لگے ہوئے بانس اور لکڑی کی بلیاں کھمبوں کا کام دیتی تھیں اور یہیں سے سارے گھروں اور دکانوں کو بجلی کے کنیکشن ملے ہوئے تھے۔

ان دونوں گرڈ سٹیشنوں کے درمیان حیاتو کا پرانا باڑہ تھا جہاں وہ اپنی بھیڑ بکریاں بند کیا کرتا تھا۔ دور دور سے بکریوں کے بیوپاری اور نامور قصائی حیاتو سے دیسی بکریاں خریدنے آتے تھے اور منہ مانگی قیمت دے کر جاتے تھے کہ قرب و جوار کے تاریخی ٹیلوں کی بوٹیاں چر کر ان بکریوں کا گوشت زعفران جیسا خوشبودار ہو گیا تھا۔ ایک روز حیاتو اپنی ساری بھیڑ بکریاں گاؤں والوں کے حوالے کر کے زیارتوں پر چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا.... کہہ کر گیا تھا کہ اگر چھ مہینے کے اندر اندر واپس آ گیا تو سب کچھ میرا، نہیں تو گاؤں والوں کا۔

حیاتو لوٹ کر نہیں آیا تو یہ باڑہ ویران ہو گیا۔ بھیڑ بکریاں حسب وصیت گاؤں والے اپنے استعمال میں لے آئے لیکن حیاتو کے باڑے کی جگہ ویسی کی ویسی پڑی رہی۔ نہ کسی نے اس پر قبضہ کیا اور نہ ہی اسے شاملات بنایا گیا۔ یہ مستطیل ٹکڑا اسی کے نام پر چلتا رہا اور اب جب انجینئر رضوان کو اس کی ضرورت پڑی تو اس نے اس باڑے کے ٹوٹے ہوئے بانسی پھاٹک پر "ودو پاور ہاؤس" کا بورڈ لگا دیا۔

چار مہینے تک بجلی گھر میں مسلسل تجربے کرنے اور ہر بار ان کے خاطر خواہ نتیجے برآمد ہونے کے بعد ایس ڈی او رضوان نے اپنے دونوں نہری پٹواریوں، ایک ضلع دار اور شہر سے بلوائے ہوئے اپنے کلرک کی مدد سے بجلی گھر میں ٹرمینلوں، سوئچوں، فیوز بورڈوں اور ڈسٹری بیوشن لائنوں کو بڑے سلیقے اور بڑی خوش خطی کے ساتھ دیواروں کے ساتھ فکس کر دیا۔ کوٹ کے لوگ بجلی گھر میں کام کرتے الیکٹریشنوں کے لیے ستو، لسی، روٹی پانی، چائے اور راتوں کو اوور ٹائم لگانے پر گرم دودھ اور چاول کے مرونڈے بھی فراہم کرتے رہے اور فراغت کے موقعوں پر آ کر ان کا دل بھی بہلاتے رہے۔ ان دل بہلاوہ میٹنگوں میں گندے لطیفے، خادم کے کبت، میاں محمد کا کلام، احوال الآخرت کے بند، مکے مدینے کے سفر کے واقعات اور ببو سارو کے ادھلنے کی کہانی کے تینوں رخ

شامل ہوتے تھے۔

ایک شام رضوان صاحب ایس ڈی او نے گاؤں کے سب لوگوں کو بجلی گھر کے سامنے جمع کر کے اعلان کیا کہ کوٹ ودو کا اتھیرئیل پاور ہاؤس تیار ہے اور آج رات اس کو چالو کر دیا جائے گا۔ سب لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور اضطرابی جوش کے چیخ دار نعروں سے سارا گاؤں سر پر اٹھا لیا — لیکن —

"لیکن" انجینئر رضوان نے اپنی مخصوص نیم نسوانی آواز میں کہا "آپ لوگوں کو زندگی بھر اسی طرح سے رہنا ہو گا جس طرح سے آپ آج تک رہتے آئے ہیں اور اپنے درمیان محبت، چاہت، لطف اور کرم کو کم نہیں ہونے دینا ہو گا۔ میں نے اپنی مشینوں سے اور بہت ہی حساس آلات سے اس حقیقت کی تحقیق کر لی ہے کہ کوٹ ودو اور اس کے ارد گرد کا علاقہ، اس کے کھیت اور کھلیان اور اس کے راستے اور راجباہے ایک بہت ہی بڑا مقناطیسی حصار ہیں اور اس یونٹ کے اندر آپ لوگوں کا اجتماعی وجود ایک روٹر کی حیثیت سے گھوم رہا ہے۔ آپ لوگ اپنے درمیان ایک دوسرے سے بے پناہ محبت رکھنے کی وجہ سے توانائی کے ایسے یونٹ بن گئے ہیں جن کو بجلی جنریٹ کرنے کے لیے کسی قسم کے ایندھن کی یا باہر کی طاقت کی مطلق ضرورت نہیں۔ آپ کم ازکم اپنے علاقے کی بجلی کے لیے خود کفیل ہیں اور اسی خود انحصاری کی بدولت آنے والی صدیوں تک اسی طرح سے بجلی پیدا کرتے چلے جا سکتے ہیں بشرطیکہ۔"

یہاں آ کر رضوان صاحب خاموش ہو گئے۔ سب لوگ انتہائی خاموشی کے عالم میں خوف زدہ ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح گم سم کھڑے رہنے کے بعد رضوان ایس ڈی او نے کہا "بشرطیکہ تم اپنے درمیان محبت کے موجودہ خزانے ختم نہ ہونے دو اور انسانی چاہت کے دفینوں میں کمی نہ آنے دو۔ تمہارے چہرے اسی طرح بشاش، دل اسی طرح مسرور اور روحیں اسی طرح شاداں اور فرحاں رہیں۔ اگر آپ کے ذہن سے اٹھنے والے شیشہ دل کے اندر ذرا سا بھی بال آ گیا اور اس میں آنٹ، عداوت، حسد، جلن کا غبار اپنی جھلک دے گیا تو پھر تمہارا سارا علاقہ گھپ اندھیرے میں اور تمہارے اپنے اندر گہری تاریکی میں ڈوب جائیں گے۔ لاگ لپٹ اور کرودھ کپٹ کے ذرا سے چسکے کے بدلے بھری بہاروں اور بستے گلستانوں کا سودا نہ کر

لینا۔ ایک بار آئی ہوئی خزاں نے پھر واپس نہیں جانا۔"

لوگوں نے ہاتھ، لاٹھیاں، ڈنڈے اور عصے اوپر اٹھا کر کہا "سن لیا اور مان لیا۔ ہم جاننے والے لوگ نہیں، ماننے والے لوگ ہیں۔ یقین والے لوگ ہیں۔ ایمان والے لوگ ہیں۔ ایمان والے ساتھی ہیں۔"

ایس ڈی او رضوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر ہجوم سے اماں چراگو بھڑبھونجن کی کلائی پکڑ کے اسے باہر کھینچا اور باڑے کی دیوار سے کسے ہوئے بڑے سارے سوئچ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اماں چراگو اتنے سارے لوگوں کے سامنے کچھ شرمائی اور بہت ساری گھبرائی سی کھڑی تھی۔ رضوان نے کہا "لے اماں، بسم اللہ کر کے اس سوئچ کو اوپر اٹھا دے۔"

اماں چراگو نے سر پر دوپٹے کی بکل دوہری کر کے "بسم اللہ" کہا اور سوئچ اٹھانے کے لیے زور لگایا لیکن اس سے سوئچ اٹھایا نہ گیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے رضوان کی طرف دیکھا تو رضوان نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اماں نے اپنی تڑخی جلد والا ہاتھ راکھ بھری مٹیالی چیکٹ آستین پر رگڑا اور ایک مرتبہ پھر "بسم اللہ" کہہ کر سوئچ کی سیاہ چمک دار ہتھی کو پورے زور سے اوپر اٹھایا تو سوئچ کا "یو" پہلے کے مقابلے میں کافی اوپر اٹھ گیا۔ کافی اوپر اٹھنے سے حوصلہ پا کر اماں نے اپنے کندھے کی اڑیس دے کر سوئچ کھڑانک سے پورا اوپر اٹھا دیا اور اس کھڑانک کی آواز کے ساتھ ہی سارا کوٹ ودو بقعہ نور بن گیا۔ لوگوں کے منہ سے بے اختیار "سبحان اللہ" کی چیخ نکلی اور پھر "سبحان اللہ سبحان اللہ" کے آوازے بڑے بڑے مرغولوں کی صورت میں سارے مجمع کے اندر گھومنے لگے۔ ان گردابوں کے اندر مولوی صاحب نے اپنی غیر مترنم آواز میں دہقانی طرز کی قرات شروع کر دی جس کا مطلب تھا:

خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے
اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے
چراغ ایک قندیل میں ہے
اور قندیل ایسی گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے
اس میں ایک مبارک درخت زیتون کا تیل جلایا جاتا ہے

یہ نہ مشرق میں ہوتا ہے اور نہ مغرب میں
اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے پھر بھی جلنے کو تیار ہے
روشنی پر روشنی
خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے
اور خدا جو مثالیں بیان فرماتا ہے تو لوگوں کے لیے
اور خدا ہر چیز سے واقف ہے!

پھر گاؤں کے نمبردار نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "کوٹ ددو کے لوگو! اللہ نے تم پر بہت بڑا اکرام کیا ہے کہ تم کو ایسے نور سے نوازا ہے جس پر ایک پیسے کی لاگت بھی نہ اٹھے۔ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر واجب ہے کہ ہم ساری رات اس کی حمد و ثنا کریں اور اس کے محبوب کے گن گائیں۔ آج رت جگا ہو گا اور ہم سارے یہیں قیام کریں گے، سوائے ان بیبیوں کے جن کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور جن کے کچھ گھریلو کام رہ گئے ہیں۔"

مولوی صاحب نے اٹھ کر کہا "بے شک نمبردار صاحب کی بات سولہ آنے اور چالیس سیر درست ہے اور ہم کو ہر وقت اپنے خالق کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیے لیکن دوستوں سے ملنا، عزیزوں رشتہ داروں کی تکریم کرنا اور صلہ رحمی ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ آج کی رات خوشیوں کی اور مہربانیوں کی رات ہے اس لیے ہم ایک دوسرے کے درمیان خوشیاں تقسیم کریں گے اور مہربانیوں کی پھوار سے ایک دوسرے کو بھگو کر ٹھنڈک سے مالا مال کر دیں گے۔"

نمبردارنی بولی "ہم عورتیں مل پوئے، حلوہ، میٹھی روٹیاں اور گڑ کے گلگلے پکائیں گی اور نمبردار سر پر پرات رکھ کر اور آواز لگا کر انہیں دور دور بیٹھی ٹکڑیوں میں تقسیم کرے گا اور جو بی بیاں اس وقت بچوں کے ساتھ گھروں میں ہیں، ان کے لیے نمبردار یہ سوغاتیں اپنی بیٹی اور بھانجی کے سروں پر رکھ کر گھر گھر پہنچائے گا۔"

نمبردار نے کہا "مجھے منظور ہے!"

پھر نوجوان ہزار ہزار کینڈل پاور کی بتیوں تلے پنجہ لڑانے، بنی پکڑنے اور گن کر ڈنڈ لگانے لگے۔ لڑکے "اپنا من میچنا" اور "محمود کا ٹٹو" کھیلنے لگے۔ لڑکیاں گدے کے

جھومر میں بیٹھ کر کر تھال ڈالنے لگیں اور بڑی عورتیں اینٹیں جوڑ کر چولھے سلگانے لگیں۔

کامے مرد تو اپنے کھڑے زانوؤں اور کمر کے گرد پٹکے ڈال کر چپ چاپ بیٹھ گئے لیکن سفید اور کڑبڑی ڈاڑھیوں والے بزرگ شرارتی موڈ میں اتر کر ایک دوسرے کو مخول کرنے لگے۔ بلبوں کی دودھیا روشنی میں ان کے گندم گوں سرخ چہرے شب برات کے پٹاخوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جن کے پھٹنے میں ذرا سی کسر باقی رہا کرتی تھی۔ مولوی صاحب میٹھی روٹی کے انتظار میں اپنی جوانی کا قصہ سنا رہے تھے جب وہ برساتی نالے سے سیر بھر گول گول پتھریاں اٹھا اٹھا کر کھا جاتے تھے اور اوپر سے پاؤ بھر آٹا پانی میں گھول کر پی جاتے تھے۔ نہ بھوک نہ پیاس، دو دو دن اچھے خاصے گزر جاتے اور صبح حاجت کے وقت پتھریاں صحیح سلامت برآمد ہوجاتیں۔

صبح چار بجے جب سب لوگ مال پوئے، میٹھی روٹیاں اور گڑ کے گلگلے کھا کر غٹ ہوگئے اور نمبردار نے پکار کر کہا کہ اس کو سحری جان کر شکرانے کا روزہ ہی رکھ لیں تو مولوی صاحب نے کہا "اب تو سفید دھاگے اور کالے دھاگے کا ملاپ ختم ہو گیا نمبردار جی، اب تو دونوں ہی سفید دھاگے ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد نیت کرنے سے روزہ مکروہ ہوجائے گا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے!"

جو لوگ زیادہ پیٹ بھر جانے سے زمین پر ہی لم لیٹ ہوگئے تھے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "اب ہماری مرضی نہیں مولوی جی، ٹھہر کے سہی۔ اس جمعرات کو روزہ رکھیں گے اور یہ ہے بھی نوچندی جمعرات۔"

کوٹ ودو کے بجلی گھر کی خبر دور دور تک پھیل گئی اور لوگ یکوں پر، ریڑھوں پر اور ٹریکٹروں پر دور دور سے آنے لگے اور اس انوکھے بجلی گھر کو دیکھنے لگے۔ گاؤں والوں نے باہر شاملات میں ایک بڑا تنبو تان دیا تھا اور اس کے نیچے چارپائیاں ڈال دی تھیں۔ جو کوئی بھی آتا اسے کھانا کھا کر اور دو گھڑی آرام کر کے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ سواریوں کے لیے گھاس دانے کا الگ انتظام تھا۔ نوجوان لڑکے دور سے آنے والے گھوڑوں کی مالش کرتے، پھر ان کے منہ پر توبڑے چڑھاتے تھے۔ بہت دور سے آنے والی ڈاچیوں کو شکر اور پھٹکڑی کے پانی کی بالٹیاں تیار ملتیں۔ لوگ نہاتے بھی، کھانا

بھی کھاتے اور حقہ بھی کھینچتے اور ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتے کہ ہماری بستیوں میں ایسے بجلی گھر نہیں لگ سکتے! لیکن پھر خود ہی اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اتنی دشمنائیاں، اس قدر آنٹھ عداوت اور آپس میں اتنی مقدمے بازیوں کے ہوتے ہوئے بجلی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے! کئی ایک سمجھ دار لوگوں نے واپس جا کر گاؤں میں پنچائتیں بھی کیں، پرانے بیریوں کو سمجھایا بجھایا بھی، ان کو مفت کی بجلی کے فوائد سے بھی آگاہ کیا لیکن ان میں صلح صفائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور قدیمی عداوتوں کی وجہ سے بجلی گھر کا منصوبہ ویسے کا ویسا رہ گیا۔

ماسٹر کریم بخش تیلی بی اے بی ایڈ، کوٹ ددو ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ تھے تو نوجوان اور تھے بھی خوبصورت لیکن اپنے نام کے ساتھ تیلی ضرور لکھتے تھے۔ مستقیم خان نائب تحصیل دار، یاسین ذیل دار، محمد امین نمبردار اور گاؤں کے دیگر معزز لوگوں نے کئی مرتبہ سمجھایا کہ ماسٹر صاحب اپنے نام کے ساتھ تیلی نہ لکھا کریں، اس طرح علم کی توہین ہوتی ہے لیکن وہ نہیں مانے اور اسی طرح لکھتے رہے۔ ایک مرتبہ بڑے بزرگوں کے کہنے پر ایس ڈی او رضوان نے بھی ان پر زور دیا کہ وہ اپنے اس لاحقے کو چھوڑ دیں لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب نے معذرت کر لی اور بتایا کہ ان کی ساری سندوں پر اور ڈگریوں پر بھی ان کے نام کے ساتھ تیلی چھپا ہوا ہے اس لیے وہ اپنے نام کے اس لاحقے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ پھر انہوں نے تفریح کی گھنٹی میں سینکڑوں لڑکوں کو شور مچاتے، کدکڑے مارتے اور درختوں سے جھولتے دیکھ کر ان کر طرف اشارہ کیا اور محبت سے کہا "رضوان صاحب! یہ سارے مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور مجھے تیلی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں ان سے یہ رحمت بھرا لفظ چھین کر کس لیے ان کو اس نعمت سے محروم کر دوں۔ یہ مجھے اپنی جان سے بھی پیارے ہیں۔"

جب ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب کے والد فوت ہوئے تو کریم بخش کی عمر دو سال کی اور اس کی چھوٹی بہن رضیہ کی عمر ایک سال کی تھی۔ ان دونوں کی والدہ ٹھیک انیس سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور انیس سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک اکیلی کولھو چلا کر کچی گھانی کا تیل نکال کر بیچتی رہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے تین بیل بھی خریدے اور اپنے دونوں بچوں کی شادی بھی بڑی دھوم دھام سے کی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب

کو اپنی نیک نیت، محنتی اور ہنس مکھ والدہ سے اس قدر پیار تھا کہ انہوں نے اپنی ماں کے پیشے کو اپنے نام کا ایک جزو بنا لیا تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ اس جزو کی وجہ سے ان کی والدہ کی روح ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے اور سکول کے سارے کاموں میں ان کی مدد کرتی ہے۔ اس روح سے مدد حاصل کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے گرد ایسے استادوں کا حصار قائم کر لیا تھا جو مزاج کے غنی، طبیعت کے غنی اور فرائض کی بجا آوری کے کمانڈو تھے۔

ماسٹر منظور ریاضی کے اور ماسٹر اشتیاق اُردو فارسی کے اُستاد تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی جان تھے اور ہر وقت اکٹھے رہتے تھے۔ پانچ کمرے کے بورڈنگ ہاؤس میں ان دنوں اُستادوں کی وجہ سے بتیس طالب علم رہائش پذیر تھے اور ساٹھ روپے مہینے میں دو وقت کی اچھی روٹی کھاتے تھے۔ ماسٹر منظور چپاتی بھی بنا لیتے تھے اور خشکہ چاول بھی تیار کر لیتے تھے۔ ماسٹر اشتیاق ترکاری بنانے کے ماہر تھے۔ گوبھ کے بازے کی سبزی، خوشی محمد کے گھر کا خالص گھی اور کرم علی کی دکان کا نمک مرچ اور گرم مصالحہ..... یہ سب چیزیں تحفتہً آتی تھیں اور ماسٹر اشتیاق کی تحویل میں پہنچ جاتی تھیں۔ اُنہوں نے نویں جماعت کے تین طالب علم ایسے مسالچی تیار کیے تھے کہ ماسٹر صاحب کی غیر موجودگی میں سالن کا دیگچہ بھی بنا لیتے تھے۔ ہر جمعرات کو ڈرائنگ ماسٹر خرم مسیح ولائتی پڈنگ بنا کر اس پر دیسی پستے کی ہوائیاں اس خوبی سے نچھاور کرتے تھے کہ مشرق مغرب یک جان ہو جاتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب نے ایک روز رضوان صاحب کو سکول کے سامنے روک کر کہا "آپ ایک مرتبہ چیک کر کے دو پاور ہاؤس کی وولٹیج تو معلوم کریں۔ شاید بیچ بیچ میں سے ٹوٹتی ہو۔"

رضوان نے حیرانی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا تو اُنہوں نے کہا "ہمارا چپڑاسی الطاف ذرا بدنیت سا آدمی ہے۔ کام تو ٹھیک ٹھاک کرتا ہے، لیکن دل کی خوشی سے نہیں کرتا۔ اس کا ضرور اثر پڑتا ہو گا۔ میرا خیال ہے بہت سی کرنٹ نیوٹرلائز ہو جاتی ہو گی۔"

رضوان نے کہا "آپ فکر نہ کریں، میں کل صبح سویرے چیک کر لوں گا۔ دس

بجے ایک موگھے کی شکایت سننے جانا ہے۔ صبح دُعا کے وقت آجاؤں گا۔ اس وقت سارے اُستاد اور طالب علم ایک ہی جگہ موجود ہوں گے۔"

ہیڈ ماسٹر نے ایس ڈی او صاحب کو موتیے کا وہ پھول پیش کیا جو اُنہوں نے اپنے دفتر کے آگے سے توڑا تھا اور جس کو وہ دس بارہ مرتبہ سونگھ چکے تھے۔ ایس ڈی او رضوان نے پھول لے کر اپنی عینک کی کماتی تلے دائیں کنپٹی کے پاس دبا لیا اور شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا۔

حیدر والا، گلو کے اور روالیاں گاؤں نے یکے بعد دیگرے کوٹ ودو کے بجلی گھر کو چار چار عرضیاں گزاری تھیں کہ اُنہیں بھی بجلی کا کنیکشن دیا جائے اور جو ریٹ سرکار کا ہے، اس کے مطابق خرچہ لیا جائے لیکن کوٹ ودو الیکٹرسٹی کمیٹی نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ روالیاں گاؤں چونکہ بالکل سامنے دو میل کے فاصلے پر تھا اس لئے اس کا حق فائق تھا۔ لیکن وہ دو چکیوں، ایک روئی پینجنے کی مشین اور لکڑی اور لوہے کی تین خرادیں چلانے کے لئے دس ہارس پاور کی موٹر کا کنیکشن بھی مانگتا تھا، اس لئے کمیٹی نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ رضوان کا خیال تھا کہ حیاتو کے باڑے کا گرڈ سٹیشن اتنے لوڈ کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لئے فی الحال ہر درخواست سے معذرت کر کے ہی گزر جانا چاہیے۔

سکول کے خوبصورت باغیچے میں ہیڈ ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب تین سیڑھی اُونچے منبر پر سر جھکائے کھڑے تھے اور اُن کے گرد اُن کا سٹاف ادب اور انکسار کے ہاتھ سینے پر باندھے نیم دائرے کی شکل میں موجود تھا۔ لڑکے لہک لہک کر "لب پہ آتی ہے دُعا" گا رہے تھے اور سارا گاؤں اس نیلگوں نغمے کی لپیٹ میں انڈوں پر بیٹھی کبوتری کی طرح شانت اور پُرباش تھا۔

ایس ڈی او رضوان نے کسی کی توجہ بٹائے بغیر جب باغیچے کے آہنی قوس والے جنگلے کے نیچے کھڑے ہو کر وہاں سے پیدا ہونے والی بجلی کو جانچنے کی کوشش کی تو وولٹ میٹر کی سوئی زور سے جھلملا کر اور موت کا سا جھٹکا کھا کر زیرو پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ رضوان نے جلدی سے میٹر کی ناب دو ڈگری اُوپر چڑھا کر پھر چیک کیا تو خوشی کے مارے اس کے منہ سے ایک بے ہودہ سی چیخ نکل گئی۔ میٹر چار سو چالیس وولٹ دکھا

رہا تھا۔

باغیچے کے دوسرے کونے میں آہنی جنگلے سے تیس ڈگری کے زاویے پر 440 وولٹ کا ایک نیا گرڈ سٹیشن "سکول گرڈ نارتھ چار سو چالیس وولٹ" قائم کیا گیا۔ روالیاں والوں کو اطلاع کر دی گئی کہ وہ مضبوط کھمبے اور نئی تاریں ڈال کر 440 کا کنیکشن لے لیں اور اپنے سکول کے ساتھ ایک سب سٹیشن قائم کر لیں۔

روالیاں والوں نے اعلیٰ درجے کے پانچ ڈھول اور دس بھرائی منگوا کر اپنے گاؤں میں چھنج ڈال دی۔ نوجوان بھنگڑے کے مقابلے کرنے لگے اور لڑکیاں سکول کی دیوار سے چادریں اور کھیس باندھ کر اُن کی اوٹ میں گدا ناچنے لگیں۔ نمبردار نے آرڈر بول دیا کہ لڑکیاں ناچیں ضرور..... خوشی کا دن ہے' پر گیت کے بول نہیں اُٹھائیں گی..... گدے کے ساتھ بھرے منہ کی پھونک سے پھر پھر کی پھرت بے شک دے لیں۔ بھنگڑے والے جوان پردے کے اس پار ڈھیلے ہونٹوں کی پھر پھر اور گدے کی باج سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں کون سی بولی گا رہی ہیں' وہ اس کے جواب میں اگلی بولی شروع کر دیتے تھے۔ صبح چار بجے جب گانا بجانا ختم ہوا تو رات کے گئے روالیاں کے ٹریکٹر ٹیلیفون کے استعمال شدہ کھمبے اور تاروں کے بڑے بڑے لچھے لے کر گاؤں کی سرحد میں داخل ہو رہے تھے۔

تین دن کے اندر اندر روالیاں گاؤں کو کوٹ ودو پاور ہاؤس سے چار سو چالیس کا کنیکشن مل گیا اور اُن کی آٹے کی ایک چکی چالو ہو گئی۔ ہفتے کے اندر اندر خرادیوں اور روئی پینجے والوں نے بھی ٹمپریری چھپر ڈال کر اپنا کام شروع کر دیا اور دونوں مسجدوں نے گھروں کو روشنی ملنے سے بارہ گھنٹے پہلے اپنے اپنے لاؤڈ سپیکر کا بندوبست کر لیا اور یوں موضع روالیاں بجلی والے دیہات کی صف میں آ گیا۔

کوٹ ودو کا بجلی گھر چالو ہونے سے یہاں کے لوگوں کی زندگی میں ایک عجیب طرح کا انقلاب آ گیا۔ پہلے اگر اُن کے درمیان تھوڑی بہت اُڑ پھس اور چھینا جھپٹی تھی بھی تو وہ بالکل ختم ہو گئی۔ اس گاؤں کے رقبے چونکہ بہت بڑے نہیں تھے اور کوئی خاص جاگیردار اس علاقے کا تھا نہیں' اس لئے لوگوں کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ قائم تھا۔ بس تین چار لڑکے دوسروں کی شہ پا کر اور ارد گرد کے لوگوں کی خرمستی کا

نظارہ پا کر دوبئ چلے گئے تھے مگر جلد ہی لوٹ آئے کہ وہاں اُن کا دل نہ لگا اور سکوں کی لین دین ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ واپسی پر گھر والوں نے کچھ کہا نہ گاؤں والوں نے طعنہ زنی کی۔ اپنے اپنے عشق جہاں چھوڑ کر گئے تھے، وہیں سے پھر شروع کر لئے اور اُن کی محبوباؤں نے پوچھا تک نہیں کہ ہمارے لئے بدیش سے کیا تحفہ لے کر آئے ہو! ایسے محبت بھرے انسانی گروہ کے اندر گرم جوشی کے اٹوٹ تسلسل سے بجلی کا پیدا ہونا ناگزیر تھا لیکن اُسے دیکھنے والی آنکھ کی اور موقع پر پکڑنے والے دماغ کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں بہ یک وقت ایس ڈی او رضوان کی تحویل میں دے کر اس کے مقدر کی ہنڈی لکھ دی گئی تھی۔

جب یہ خبر ولایت کے اخباروں میں چھپی کہ پاکستان کے ایک گاؤں میں انسانی رشتوں کے بھرپور تعاون سے اور بنی نوع انسان کی آپس کی بے لوث محبت سے الیکٹرک سٹی پیدا ہونے لگی ہے اور اس بجلی سے وہ سارے کام لئے جا رہے ہیں جو تھرمل یا ہائیڈرو یا ایٹمی بجلی گھروں میں پیدا ہونے والی بجلی سے لئے جاتے ہیں تو الیکٹرک انجینئروں کے گروہ جوق در جوق اس فنومن کا مطالعہ کرنے کے لئے کوٹ ودو پہنچنا شروع ہو گئے۔

مہمانوں کی آمد اور اُن کے قیام کے لئے کوٹ ودو میں ایک چھوٹا سا مہمان خانہ تعمیر کیا گیا۔ بڑی سڑک سے ملانے والی کوٹ ودو روڈ کو کارپٹ کیا گیا۔ ولائتی طرز کا ایک ایئر کنڈیشنڈ ریستوران بنایا گیا جس میں ہر وقت لوک دھنیں بجا کرتیں۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ٹورسٹ گائیڈ بن کر گٹ مٹ، پٹ پٹ انگریزی بولنے لگے لیکن اُن کی انگریزی بجلی گھر کی تاریخ، اس کے آثار، اس کی اختراع اور اُس کے وجود میں آنے تک محدود تھی۔ اس کے علاوہ اگر ٹورسٹ کو کچھ اور پوچھنا ہوتا تو اُسے سکول جا کر ہیڈ ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب سے رابطہ کرنا پڑتا تھا۔

امریکی سائنس دان اس حیرت انگیز اختراع کے پیچھے پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں کے راز دریافت کر رہے تھے۔ ایف بی آئی اور سی آئی اے کے جتنے بھی اہل کار ماہرین کے روپ میں یہاں آئے تھے، اُن کو یقین تھا کہ اس دھوکے کی ٹٹی کے پیچھے ایک بہت بڑا آتش فشاں پاکستانیوں کے تصرف میں آ گیا ہے اور جس طرح اُنہوں نے